مولانا زاہد الراشدی

اسلام میں پردے کے احکام

ساتویں صدی ہجری کے معروف مفسر قرآن ابو عبداللہ محمد بن احمد انصاری نے ''تفسیر قرطبی'' میں ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ ترجمان القرآن حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما اپنے علمی حلقہ میں تشریف فرما تھے کہ ایک شخص نے آ کر مسئلہ پوچھا کہ اگر کوئی شخص کسی مسلمان کو عمداً قتل کر دے تو کیا اس کیلئے توبہ کی گنجائش ہے؟ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ نہیں، اس کیلئے توبہ کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے، وہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔ وہ شخص چلا گیا شاگردوں نے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے عرض کیا کہ ہمیں آپ نے مسئلہ اس طرح نہیں بتایا تھا، بلکہ یہ فرمایا تھا کہ قاتل کیلئے بھی توبہ کی گنجائش ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ میں نے اس مسئلہ پوچھنے والے شخص کے چہرے پر غضب کے اثرات دیکھے ہیں، میرا خیال ہے کہ وہ کسی شخص کو قتل کرنا چاہتا ہے اور اس مقصد کیلئے مسئلہ پوچھ رہا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کے شاگرد سعید بن عبیدہ کا کہنا ہے کہ ہم نے اس شخص کا پیچھا کیا اور تحقیق کی تو پتہ چلا کہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کا اندازہ درست تھا۔ (تفسیر قرطبی، سورۃ النساء، آیت ۹۳)

اس کا مطلب یہ ہے کہ امت کے ذمہ دار مفتی حضرات اور فقہا کسی شخص کو مسئلہ بتاتے ہوئے یا کسی ماحول میں مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے شرعی اصولوں کے ساتھ ساتھ اس بات کا لحاظ بھی رکھتے تھے کہ مسئلہ پوچھنے والے کا مقصد کیا ہے؟ اور ان کے فتویٰ کو کس غرض کیلئے استعمال کیا جائے گا؟

یہ واقعہ مجھے محترم جاوید احمد غامدی کا انٹرویو پڑھ کر یاد آیا جو چند روز قبل ''پاکستان'' میں چھپا ہے اور جس میں انہوں نے فرمایا ہے کہ دوپٹہ ہمارے کلچر کا حصہ ہے اور اسے شریعت کا حصہ قرار دینے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ ممکن ہے غامدی صاحب محترم یہ فرما دیں کہ میں نے کوئی فتویٰ تو نہیں دیا اور میں تو ریاستی اتھارٹی کے بغیر کسی کیلئے فتویٰ دینے کا استحقاق ہی تسلیم نہیں کرتا، لیکن ان کا یہ اشارہ بجا نہیں ہوگا، کیونکہ کسی چیز کے شرعی یا غیر شرعی ہونے پر حتمی رائے کا اظہار کرنا اور کسی چیز پر جواز یا عدم جواز کا حکم لگانا ہی فتویٰ کہلاتا ہے اور اسے کسی بھی عنوان سے بیان کیا جائے، وہ ہمارے عرف اور تعامل میں فتویٰ ہی سمجھا جاتا ہے۔

کچھ عرصہ قبل، میں نے محترم غامدی صاحب کے بعض ''تفردات'' پر اظہار کیا تو ایک ملاقات میں انہوں نے فرمایا کہ ان کے خیالات معلوم کرنے کیلئے ان کی کتابوں سے رجوع کیا جائے اور اس معاملہ میں محض اخباری رپورٹوں پر انحصار نہ کیا جائے، کیونکہ اخبارات کا مزاج یہ ہے کہ وہ کسی بھی بات میں صرف ''خبریت'' تلاش کرتے ہیں اور اسی بنیاد پر بات کو آگے

پیش کر دیتے ہیں، جس سے بسا اوقات کہنے والے کی بات اس کی منشا کے مطابق نہیں رہتی اور کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے۔ ان کے اس ارشاد سے میں نے بھی اس وقت اتفاق کیا اور کسی حد تک اب بھی متفق ہوں، لیکن اس کا یہ پہلو بہر حال میرے نزدیک تشنہ ہے کہ ان کی تصانیف سے استفادہ کرنے والوں کا دائرہ محدود ہے، جبکہ اخبارات میں ان کے ارشادات وافکار کا مطالعہ کرنے والوں کا دائرہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور ہر شخص کیلئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ کسی قومی اخبار میں غامدی صاحب کا کوئی ارشاد پڑھ کر اس میں اجنبیت محسوس کرے تو وہ ان کی کتابوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہو اور اس تحقیق میں لگ جائے کہ انہوں نے اس اخباری بیان یا انٹرویو میں جو کچھ فرمایا ہے یا ان سے منسوب جو کچھ چھپ چکا ہے، وہ وہی کچھ ہے جو ان کی کتابوں میں بیان کیا گیا ہے یا تصانیف میں ان کا موقف اور ہے اور انٹرویو یا بیان میں ان سے کوئی اور بات منسوب کر دی گئی ہے۔

اس مخمصہ کا ایک حل یہ ہے کہ زبانی انٹرویو ہی نہ دیا جائے جو اخبار یا رسالہ انٹرویو مانگے اس سے سوالات لے کر تحریری جوابات دیئے جائیں۔ دوسرا حل یہ ہے کہ سوالات کے جواب میں گفتگو کرتے ہوئے کم از کم متعلقہ کتابوں کے اہم اقتباسات کا حوالہ بھی دے دیا جائے، تاکہ جس کسی کو تردد ہو، وہ ان کتابوں سے رجوع کر کے اپنی تسلی کر سکے اور تیسرا حل یہ ہے کہ انٹرویو بیان شائع ہونے کے بعد، اگر وہ حسب منشا نہ ہو تو اس کی وضاحت کر دی جائے تاکہ کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو اور اگر یہ بھی ممکن نہیں ہے تو محترم غامدی جیسے صاحب علم وفضل کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس قسم کی خاموشی اور سکوت کو شرعاً اور عرفاً رضامندی ہی سمجھا جاتا ہے، اس لئے اس حوالے سے عوامی تاثر کو درست رکھنے کی غرض سے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ غامدی صاحب محترم کا ''پردہ'' کے بارے میں مذکورہ ارشاد درست نہیں ہے اور اس کے درست نہ ہونے کے ساتھ ساتھ معروضی حالات میں یہ سنگینی بھی اس میں شامل ہو گئی ہے کہ مغربی ثقافت اور کلچر کی ہمہ گیر یلغار کے اس دور میں ان کا فتویٰ بہر حال مسلم اور مشرقی ثقافت اور اس کی اقدار وروایات کے خلاف ہی استعمال ہوگا اور اسی حوالے سے میں نے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ دینی معاملات پر رائے دینے والے حضرات کو اور خاص طور پر ان لوگوں کو جن کی بات کسی بھی درجہ میں سنی اور مانی جاتی ہے، رائے دینے سے قبل معروضی حالات کو سامنے رکھنا چاہیے اور یہ دیکھ لینا چاہیے کہ معاشرے میں خیر اور شر کی کشمکش کے عمومی تناظر میں ان کی رائے کس کے حق میں اور کس کے خلاف استعمال ہوگی؟ غامدی صاحب محترم نے اس انٹرویو میں دوپٹہ کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے، اسے اصولی طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

☆.....دوپٹہ کا تعلق کلچر سے ہے، شریعت سے نہیں۔

☆.....قرآن کریم میں حجاب کے بارے میں جن پابندیوں کا ذکر موجود ہے، ان کا اطلاق عمومی نہیں ہے بلکہ ان کا تعلق جناب نبی اکرم ﷺ کے دور کے مخصوص حالات سے ہے۔

☆.....شریعت نے صرف سینہ ڈھانپنے اور مناسب لباس پہننے کی پابندی لگائی ہے، جس میں دوپٹہ شامل نہیں ہے۔

جہاں تک کلچر اور شریعت کا تعلق ہے، ہمیں پہلے اس الجھن کو حل کرنا ہوگا کہ کلچر اور دین کا باہمی تعلق کیا ہے؟ اور یہ

دونوں اپنے اپنے رول میں آزاد ہیں یا ان میں سے کسی ایک کیلئے دوسرے کی بالاتری قبول کرنا بھی ضروری ہے؟ شریعت ان احکام کو کہتے ہیں جو قرآن وسنت سے براہ راست یا مسلمہ اصولوں کے ذریعے بالواسطہ ثابت ہوں اور کلچر ایک علاقہ میں رہنے والے لوگوں کے باہمی رہن سہن، تعلقات، معاملات اور معاشرت سے خود بخود جنم لینے والی اقدار وروایات کو کہا جاتا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ شریعت ساری دنیا کیلئے ایک ہے، لیکن کلچر ہر علاقہ کا مختلف ہے اور کلچر وثقافت کی روایات واقدار میں علاقائی حوالے سے تنوع موجود ہے، جو انسانی فطرت کا حصہ ہے اور اسلام بھی اسے تسلیم کرتا ہے، لیکن اسلام نے کلچر کو آزاد حیثیت سے قبول نہیں کیا، بلکہ اسے شرعی اصولوں اور ضابطوں کا پابند کیا ہے، جیسا کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے جاہلی معاشرت کی ان اقدار وروایات کا ایک ایک کر کے خاتمہ کر دیا جو آسمانی تعلیمات سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں اور جن کی شریعت اسلامیہ کے احکام وقوانین میں گنجائش موجود نہیں تھی، حتیٰ کہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی اکرم ﷺ نے اپنے خطبہ میں یہ اعلان فرمایا کہ ''جاہلیت کی تمام قدریں میرے پاؤں کے نیچے ہیں''

اسلام نے کچھ اقدار وروایات کو باقی بھی رکھا جو شرعی اصول وضوابط سے متصادم نہیں تھیں۔ اب سوال یہ ہے کہ علاقائی کلچر کی جن روایات کو اسلام نے باقی رہنے دیا، ان کی حیثیت کیا ہے؟ وہ شریعت کا حصہ ہیں یا بدستور کلچر اور ثقافت سے ہی منسوب رہیں گی؟ اس سلسلہ میں صحیح بات یہ ہے کہ جن اقدار وروایات کو شریعت کے احکام وقوانین میں شامل کر لیا گیا ہے اور ان کا ذکر قرآن کریم یا سنت رسول ﷺ میں موجود ہے، وہ شریعت کا حصہ بن گئی ہیں، انہیں کلچر کا حصہ قرار دے کر شریعت سے الگ کرنا انصاف کی بات نہیں ہے، البتہ جن امور کو صرف خاموشی کے ساتھ گوارا کیا گیا ہے۔ ان کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ عرب کلچر کی باتیں ہیں، جن سے اسلام نے تعرض نہیں کیا..... اور یہ صرف عرب کلچر کی بات نہیں، بلکہ دنیا کے کسی بھی کلچر اور ثقافت کی وہ روایات واقدار جن کی نفی قرآن وسنت میں موجود نہیں ہے اور مسلمہ اسلامی اصولوں کی روشنی میں انہیں گوارا کیا جا سکتا ہے، وہ کلچر اور ثقافت کے نام پر اسلام کے ساتھ ساتھ چلتی رہیں گی۔

اس پس منظر میں محترم جاوید احمد غامدی صاحب کے ارشاد پر غور کیا جائے تو اس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ چونکہ ''دوپٹہ'' شرعی حکم نہیں، بلکہ کلچر کا حصہ ہے، اس لئے اگر کسی علاقہ کے کلچر میں دوپٹہ موجود نہیں ہے تو وہاں حجاب اور پردے کیلئے دوپٹے کی پابندی ضروری نہیں ہوگی، لیکن یہ بات شرعی اصولوں کی روشنی میں قابل قبول نہیں ہے، اس لئے کہ سورۃ الاحزاب کی آیت ۵۹ میں اللہ تعالیٰ نے صراحت کے ساتھ فرمایا ہے کہ ''اے نبی ﷺ! اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دیجئے کہ اپنے اوپر چادر لٹکا کر رکھیں وہ پہچانی جا کر اذیت نہ دی جائیں''۔

یہاں تین باتیں ہیں:

☆..... حکم صرف نبی اکرم ﷺ کی ازواج اور بیٹیوں کے لئے نہیں ہے بلکہ تمام مسلمان عورتیں اس حکم میں شامل ہیں۔

☆..... حکم میں ''جلباب'' اپنے اوپر ڈالنے کی ہدایات کی گئی جو بڑی چادر کو کہتے ہیں اور بخاری شریف کے شارح علامہ قسطلانی

فرماتے ہیں کہ ''جلباب'' دوپٹے یعنی ''قناع'' سے لمبائی اور چوڑائی دونوں میں بڑی ہوتی ہے۔

☆.....حکم میں وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ پہچانی نہ جائیں تا کہ اذیت سے محفوظ رہیں اور یہ مقصد غامدی صاحب کے بقول صرف سینہ ڈھانپ لینے سے کسی طرح بھی پورا نہیں ہوتا، بلکہ اس کے علی الرغم آیت کریمہ کا مطلب یہ قرار پاتا ہے کہ مسلمان عورتوں کیلئے صرف ''دوپٹہ'' کافی نہیں ہے، بلکہ اس سے بڑی چادر ''جلباب'' ضروری ہے اور وہ بھی اس انداز سے لی جائے کہ چادر لینے والی عورت پہچانی نہ جائے۔

یہ قرآن کریم کا صریح حکم ہے اور تمام مسلمان خواتین کیلئے ہے، جسے کلچر کی ایک روایت قرار دے کر شرعی احکام کے زمرے سے خارج کرنے کا حوصلہ محترم جاوید غامدی ہی کر سکتے ہیں۔

باقی رہی یہ بات کہ قرآن کریم کا یہ حکم صرف اس دور کیلئے خاص تھا، اگر اس پر غامدی صاحب کوئی دلیل پیش کر سکیں تو ہمیں قبول کرنے میں کوئی عذر نہیں ہوگا، لیکن اتنی وضاحت کے ساتھ کہ ''اہل السنۃ والجماعۃ'' کے نزدیک قرآن کریم کی تشریح وتعبیر اور شرعی احکام کے تعین کی بنیاد سنت رسول ﷺ اور تعامل صحابہؓ پر ہے اور اسی وجہ سے وہ جماعت اہل السنۃ والجماعۃ کہلاتے ہیں۔ ان دو بنیادوں، یعنی سنت رسول ﷺ اور تعامل صحابہؓ سے ہٹ کر قرآن کریم کی کوئی تعبیر وتشریح خوارج، معتزلہ، قدریہ، جہمیہ اور روافض کے ہاں تو قابل قبول ہو سکتی ہے، اہل سنت کے نزدیک اس کا کوئی وزن نہیں ہوگا۔

اس وضاحت کے بعد یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ بلاشبہ ایسے احکام بھی دور نبوی ﷺ میں سامنے آئے ہیں جو وقتی ضرورتوں کے ساتھ خاص تھے اور ضرورت ختم ہو جانے کے بعد وہ احکام باقی نہیں رہے، مثلاً مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کرنے کے بعد نبی اکرم ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات کرائی، جس میں ایک ایک مہاجر کو ایک ایک انصاری کا بھائی قرار دے کر انہیں ایک دوسرے کا وارث بھی بنا دیا۔ یہ ایک وقتی ضرورت تھی اور ضرورت ختم ہونے کے ساتھ ہی وہ حکم بھی ختم ہو گیا جس کی دو واضح علامتیں قرآن وسنت میں موجود ہیں۔ ایک یہ کہ اس کی جگہ متبادل احکام آ گئے اور دوسری یہ کہ متبادل حکم آنے کے بعد پہلے حکم پر صحابہ کرامؓ کے ماحول ومعاشرے میں عمل باقی نہ رہا۔ اگر غامدی صاحب اس بات پر سنت نبوی ﷺ اور تعامل صحابہؓ سے کوئی شہادت پیش کر دیں کہ حجاب کے بارے میں سورۃ الاحزاب میں جو احکام دیے گئے ہیں، ان کی جگہ متبادل احکام آ گئے تھے اور صحابہ کرامؓ نے ان احکام کی سختی کو ترک کر کے ان پر عملدرآمد کی کیفیت میں تبدیلی اور تغیر کو قبول کر لیا تھا تو ان کے اس دعویٰ پر غور کیا جا سکتا ہے کہ یہ احکام وقتی ضرورت اور مخصوص حالات کے پس منظر میں تھے جن کی بعد میں ضرورت باقی نہیں رہی تھی، لیکن اگر ان احکام کو نہ صرف صحابہ کرامؓ بلکہ بعد کے ادوار میں بھی اسی طرح عمل میں لایا جاتا رہا ہے اور امت کے تمام فقہی مکاتب فکر نے انہیں جوں کا توں برقرار رکھا ہے تو غامدی صاحب کو اپنے اس موقف پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔